خطبہ صدارت محمد طیب صاحب

اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ

حیدرآباد سندھ

۱ / اپریل ۱۹۴۸

خطه [illegible]

اللہ اکبر

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

خطبۂ صدارت

اجلاس جمعیۃ علماء صوبہ سندھ حیدرآباد (سندھ)

منعقدہ

۲۱، ۲۲، ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

از

حضرت فخر الامۃ امیر البیان مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

امیر جامعہ دیوبند

ناشر

ناظم جمعیۃ علماء صوبہ سندھ

حیدرآباد سندھ

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پیش لفظ

پیش نظر خطبہ صدارت حضرت فخر الامت امیر البیان مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیۃ علماء صوبہ سندھ ۱۵، ۱۶، ۱۷ اپریل کو سندھ کے تاریخی شہر حیدرآباد میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے۔ ان کے علاوہ مجلس احرار، مسلم لیگ اور جماعت خاکساران کے ارکان بھی موجود تھے عام شرکاء میں ہر طبقہ وخیال کے افراد حاضر تھے۔ مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی، عرفانی، اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متأثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی خطبہ کی قرأت کے بعد اس درجہ متأثر ہوئے کہ انھوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا

"میں خطبۂ صدارت سننے ہی کے لئے شریک اجلاس ہوا تھا۔ اب میرا دل ٹھنڈا ہے آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہونچا دیا"

افسوس ہے کہ وقت کی مجبور کن مشکلات کے باعث خطبہ کی طباعت و اشاعت تاخیر سے کی جا رہی ہے مگر اس کا فیضان عام۔ ہمہ گیر اور وقت کی حدود سے بالاتر ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ اس کا ہر عنوان امت اور وطن کی اعلیٰ ترین رہنمائی کا کام انجام دے گا

ناظم مجلس استقبالیہ اجلاس جمعیۃ علماء سندھ
حیدرآباد سندھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

خطبۂ صدارت

اجلاس جمعیۃ العلماء صوبۂ سندھ منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء

دنیا کے موجودہ حالات کا خلاصہ

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ - اللہ کی حمد و سپاس - اللہ کے آخری نبی پر درود و سلام اور آپ سب حضرات کے کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں اس نالائق کو بخشا گیا ہے - مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطور یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اکابر قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور و فکر میں مدد دے سکوں -

زمانہ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں

حضرات محترم ! آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے - دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں اُلجھ رہی ہے - دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں - معمورۂ ارضی کے وہ حصے جنھوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراج تحسین وصول کیا تھا - آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ اُن پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی - انسانیت اپنے نشان مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے - اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے تھرا رہے ہیں - خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوس بندگی بنایا تھا - مگر شیطان اور اس کی ذریۃ نے اُسے جنگ غلامی کا جہنم بنا دیا ہے - گذشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنم تیار کیا تھا - آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں - امیر، غریب - مرد، عورت بچے اور بوڑھے سب کراہ رہے ہیں - اور انکی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جا رہی ہے - جو مذہبی رہنماؤں کی روحوں کو تڑپا رہی ہے -

مذہب اور سیاست

وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنھوں نے مذہب و سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی - آج خدا سے آب حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں - اور جو لوگ خداوند عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل کھیل رہے

ہیں۔ اس میں کسی ملک۔ کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آج جب اس کی دراسی عمل میں آرہی ہے تو اس کی ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی۔ مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبر مطلق

جنگ کا آخری فیصلہ

جنگ ہو رہی ہے۔ یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتیٰ کہ چرچل۔ روزویلٹ اور ہٹلر وتوجو بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی۔ جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدان جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبر اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ "اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائیگا"۔ واقعات سامنے رکھکر دنیا اس قضیۂ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی جاری رہیگی گوڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۱۲ر مارچ ۴۴ئہ میں لکھا ہے کہ "جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے"۔ اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے دوارب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے دنیا کے مدبرین ان کو بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی۔ جمہوریت اور شہنشاہیت

دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رو سے کسی کمزور قوم کی آزادی۔ سلب نہ ہو سکے۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کے بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار پر کسی ایک ملک کے بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیت کے بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین المِلّی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر متحاربین ان نقطوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہیگی۔ اور اگر آج جنگ ختم بھی ہوگئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدمہ ہوگا۔

ہاں مگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کریگی۔ اور اسی کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہیگی

ہندوستان کی صورت حال

ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے۔ دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی تمام قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کا شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مفلوج بنا دیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفان مطالبات ہے جو علماء کے سروں پر سے گذر رہا ہے۔ ان مرکب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع

میسر آیا ہے۔ تاکہ ہم اس ہمہ گیر درد دُکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے نکال لیجائیں۔

گر از طغیان موجے کشتیم بر ساحل افتادا ست ۞ گہے باشد کہ کار ناخدائی می کند طوفاں

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں

میں ایک سیاسی آدمی سے زیادہ ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں۔ دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور ظن بنکر اُن کی فلک بوس عمارتوں کو پیوند خاک بنایا ہے اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔ جہل۔ ظلم۔ اور غلامی۔

جہل جہل سے حدود اشیاء نامعلوم رہجاتی ہیں۔ اچھے بُرے کی تمیز نہیں رہتی۔ کوئی قانون زندگی سامنے نہیں آتا۔ اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے قائم فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک انسان بہائم میں ملجائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔

ظلم ظلم عدل کی ضد ہے اس سے میری مراد ظلم اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلّی افراط و تفریط ہے جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے۔ قوم کی ساکھ اُکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گرجاتی ہے اور بالآخر ان بداخلاقیوں کے جراثیم سے بھری یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جاسکے۔

غلامی غلامی کی تباہ کاریاں فوضویت سے شروع ہوتی ہیں۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو۔ مرکزیت نہ ہو اس کا کوئی سر گروہ باقی نہ رہے۔ قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقتور اقوام اس پر خروج کرکے مسلّط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کیلئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے۔ اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ کلچر۔ تہذیب۔ تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقش پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کا فیصلہ قرآن حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں جنمیں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔ ارشاد ربانی ہے۔

ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ و باؤا بغضب من اللہ ذلک بانھم کانوا یکفرون بآیات اللہ

جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضب الہی کے یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الہیہ کے اور قتل

ویقتلون النبیین بغیر حق ذلك بما عصوا و کانوا یعتدون ٥	کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے۔

ذلت و مسکنت کا فرد کامل یہ تھا کہ اُن سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام۔ کبھی بخت نصر کے غلام۔ کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باجگذار کبھی مسلمانوں کے زیر حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر۔ اور کبھی امریکنوں کے لفظی ہمدردیوں پر۔ غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اُس نے کبھی انکی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی۔ جو کم از کم آدمیت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہو۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انھیں جلا وطن کیا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ایک ایک کا مال و اسباب ضبط، شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انھیں پناہ ضرور دی مگر انکی کسی ادنیٰ توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیونکہ برطانی مدبروں کے اندازے سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجہ کی ذلیل و رسوا قوم جانتے ہیں۔ اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں اسیطرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ انکی ساتھ ہو مگر کوئی اچھی رائے ان کی ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ۔ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی اُن کے لئے قرآن نے مخصوص کر دی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآن نے عصیان بتلایا ہے جو عملی سیہ کاری ہے اور اسکا سبب اعتداء فرمایا گیا جسکی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے۔ جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ انکی ساتھ لاعلمی کا کیا جاوے۔ اور یہی وہ جہل ہے جس سے خیر و شر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ پس یہود کی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بد اعمالیوں سے اور بد اعمالیوں کا منشاء ظلم اخلاق اور جہل نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی سے بڑی قوم کو برباد کرنیکے ضمانت دار ہیں۔ ظلم، اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیۃ سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآن حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے جس سے انکی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت آلہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شران دو چیزوں ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انھیں کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔ ارشاد ربانی ہے۔

انا عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلوماً	ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی سو انھوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان نے اسکو اپنے ذمے لیا بیشک وہ بڑا ظالم اور

جھوٹا۔ | بڑا جاہل تھا۔

یعنی اس میں قوت علمیہ اور قوت عملیہ (اخلاق حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاق کی استعداد تھی۔ جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوًا فى الارض ولا فسادًا والعاقبة للمتقين۔

یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو۔ اور فساد ضدِ صلاح ہے اور صلاح ورشد کا فقدان وہی ظلم النفس ہے خواہ عملی ہو خواہ اخلاقی۔ پس آثار جہل و ظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جا سکتی ہے تو وہی اس کا جہل و ظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیر دستی پیدا کر سکتی ہے تو یہی ظلم و جہل۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کر کے اُسکی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے۔

واذ قال ربك للملائكة انى جاعلٌ فى الارض خليفة۔ قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤنگا زمین میں ایک نائب فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خونریزیاں کریں گے۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے۔ جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم

ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم و جہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے۔

واذ تاذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيمة من يسومهم

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلّط کرتا رہیگا

سوء العذاب۔ | جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہونچاتے رہیں گے۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے۔ بہرحال ان آیات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں ظلم و جہل اور غلامی۔ اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئیگی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انھیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی پہلی قوم میں شمار کیئے جانیکے قابل نہ رہیں۔ ادھر تو بر تو جہالت نے تو اُن میں سے خیر و شر کی تمیز اُٹھادی اچھے بُرے کا فرق مٹا دیا۔ حدود اشیا ان کے قلوب پر مخفی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق پھیلا چکے تھے۔ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مانکر انواع و اقسام کے شرکوں میں بتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سیکڑوں بتوں کا بتخانہ تھا۔ جو انسانی زندگی کے مالک تصور کیئے جاتے تھے۔ انھیں سے مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ اُن ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور اس کے سامنے سر عبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور اُمتی کا فرق مٹا چکے تھے۔ رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دیدیا تھا۔ اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیر دین کی تمیز اُٹھ چکی تھی۔ دین کو غیر دین سمجھکر الحاد کا شکار تھے اور غیر دین کو دین جانکر بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلم اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاق فاضلہ کا اُن میں کوئی شمہ باقی نہ رہا تھا۔ اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار نہ تواضع، نہ بے نفسی نہ للٰہیت نہ صبر نہ شکر، نہ اعتماد نہ توکل، ہاں رات دن کا شیوہ تھا۔ تفاخر و اترا ہٹ، بے رحمی و قساوۃ، شیخی و رعونت، کبر و نخوت سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسناکی و خودستائی اور ان بد اخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا وہ لوٹ گھسوٹ، قتل و غارت، زنا و شراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنھوں نے انکی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ اُنمیں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا نہ ملکی تمدن، نہ شہریت نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا۔ جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا بدویت و بربریت طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انھیں اُسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہونچا دیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام کبھی غیروں کے گرفتار، اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں سے آثار نبوت مٹا دیئے تھے اور فوضویت و غلامی نے اُن میں سے آثار سلطنت محو

محو کردیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی نہ سیاست۔ جس کا خون انہی تین امراض ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمت الٰہی کا ظہور علم نبوت مکارم اخلاق اسوۂ حسنہ آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل۔ تاریک پیکر۔ اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتاب جہانتاب چمکا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو۔ اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چنانچہ اپنی یہی تین شانیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

انما بعثت معلّماً	میں بلاشبہ معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق	میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کر دوں

ایک جگہ آپ کے بارہ میں ارشاد الٰہی ہوا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ	البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم و اخلاق و عمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود واشگاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا و ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے ان جائز اعمال کے دواعی دلوں میں اُبھریں۔ عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے ٹھیلنے یا اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گذرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمت حیات بخشی گئی ہے۔ اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت و استقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جسمیں مرکزیت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشر و اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت مادی و روحانی طاقت اور غلبۂ تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کر دے۔

بہرحال قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اُصول علم نافع (حکمت نظری)، خلق عادل (حکمۃ اخلاقی)، اسوۂ حسنہ (حکمۃ عملی)، جنھوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے اور حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انھوں نے دماغوں کو روشن کیا۔ اخلاق سے قلوب کو جگمگایا۔ اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا۔ اور ان تینوں روشن ہتیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ان تین طاقتوں کے ذریعہ سے خدا نے

اپنے قرآنی وعدہ کے مطابق اُن کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جما دیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی پہلے مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپ نے خراج لیا۔ اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم۔ مقوقس۔ بادشاہ مصر۔ نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیجکر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک کھلا تو لسانِ نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دور صدیقی میں خالد بن ولید کے دست حق پرست پر بہت سے بلاد فارس ابو عبیدہ کے ہاتھ پر متعدد بلاد شام۔ عمرو بن عاص کے ہاتھ پر کتنے ہی بلاد مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقی آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیار مصر، تمام اقلیم فارس اور روم وقسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے۔ دولت عثمانی کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی۔ زمین کے مشارق ومغارب تک یہ رو جا پہنچی بلاد مغرب سے اقصاء، اندلس قبرص۔ قیروان۔ بلاد سبتہ اور بحر محیط تک ادھر ناحیۂ مشرق سے اقصائے بلاد چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق وخراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو کر مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشینگوئی ارشاد فرمایا تھا کہ

ان اللہ زوی لی الارض فرأیت مشارقها ومغاربها وسیبلغ ملك امتی ما زوی لی منها۔ (ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۱۳۰)	اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے زمین کے تمام مشرق ومغرب کو دیکھا اور عنقریب میری اُمت کا ملک اس حد تک پہنچکر رہیگا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق ومغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا بہت سے وہ ناحیے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتوحات کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چنانچہ ہندوستان، افغانستان جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم انکی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت وبر اور مدر وخیمے اور مکان، میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں سے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے۔

ھو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله	وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تاکہ اسکو تمام دینوں پر غالب کر دے (باعتبار حجۃ ودلیل بھی اور بلحاظ

وکفیٰ باللہ شہیدًا۔	شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرنِ اول میں ہوا کیفا۔ اور قرنِ آخر میں ہوا کما،

بہر حال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دست حق پرست پر ظاہر ہوئیں۔ جنھوں نے برکات نبوت سے متبرک ہو کر اپنے ظلم کو عدل اخلاق سے۔ جہل کو علم نافع سے اور عمل کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال سے مستنیر کیا۔

زمانۂ جاہلیت آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیری صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصُول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہے جس کا قبل از بعثت نبوی چودہ صدی پیشتر تھی۔

وفورِ جہل وفورِ جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے جاتے ہیں اسی نسبت سے امت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے اصُول اعتقادات تک میں شکوک و شبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں کسی کو خدا کے وجود ہی میں کلام ہے۔ کسی کو اس کی صفات میں۔ کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثارِ نبوۃ یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل و ثقہ ہیں۔ کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ۔ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں۔ اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے۔ اور کوئی سرے ہی سے اُسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلہ میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں۔ پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فیصدی ۹۹ علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ملاازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے کوئی مولوی کا غلط مذہب ٹھہرا کر اس روش ہی کو اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنیکی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ پس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری اس سے زیادہ مہلک مرض ہے۔ جو مسلمانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ اون پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟ اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے۔ اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک بھی مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی

ہوئی ہے اور اس سے جماعتی و اجتماعی طاقت میں روز بروز غلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدان اخلاق ادھر اخلاقی بے مائگی علمی تہیدستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسمی گدیاں اور تحصیل وصول کی چوکیاں بنکر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لیکر لوگ نکلیں سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائر دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لیکر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب و سنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھجاتی ہے سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے عادت و عبادت کی بدعات و محدثات میں طبائع اُلجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھکر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم رہجاتے ہیں نہ اُن میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال و کیفیات اور نہ اخلاقی مقامات و اقوال جبلی بد اخلاقیاں حسد و ریا کبر و حرص، اسراف و بخل، جبن و دوں ہمتی۔ جاہ پرستی و جاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ انکی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل و تتمیم جو مقصد نبوۃ تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اُصول کے بجائے نفسانی جذبات اور اُن کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سرپھٹول۔ نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سرپھٹول۔ باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے آج اُمت اُس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی۔ اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص اُن کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامۂ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع و جدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے توافق اور توافق کی راہ میں غمخواری۔ دوسروں کی دلداری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لئے شفقت و ایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمرات غلامی۔ ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال و خودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت میں ہے نہ معیشۃ۔ نہ تنظیم ہے۔ نہ قومی وحدت طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے۔ اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق و تحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقہ عمل کا ہی اختلاف آجاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع و جدال بنے بغیر نہیں رہتا پھر یہ اختلاف کسی اُصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء و قیاسات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اوسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعہ نزاع و جدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت و سیاست تباہ ہوجانے کے نتائج بد۔ بہر حال قوم کا نظام علم و اخلاق جو مجموعۂ دیانت ہے

ایک طرف مختل ہے اور نظام آزادی جو خلاصۂ سیاست ہے دوسری طرف مضمحل ہے۔ اس لئے آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود اُن کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار نمایاں ہونے چاہئیں تھے وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ و جدل نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن و سکون گھروں شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا ہو چکا ہے، بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت و خواری اور بیبسی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں۔ اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت و عیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اُسے آسمانی بم زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے نہ اُسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دھار فولادی بارش سے اُسے سنگوا لیتے ہیں، نہ اُسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت البحریاں اُسے اور زیادہ نہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات نباتات حیوانات سب اسکی دشمنی پر کمربستہ ہیں۔ پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے۔ تو طرح طرح کے امراض و مصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتی ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعدا اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اُسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کیلئے نہ آج انسان کارآمد ہے۔ نہ غیر انسان جسکا حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں۔

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون۔

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال کا مزہ اُنکو چکھادے تاکہ وہ باز آجائیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم

اور جو کچھ بھی تمھیں دکھ پہونچتا ہے۔ سو وہ تمھارے ہی کرتوتوں کے سبب سے۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے یہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے۔ اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اسنے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین نسوا الله فانساهم

اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو۔ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا

انفسھم اولئک ھم الفاسقون سو اللہ نے خود انکی جانوں سے انھیں بھول میں ڈالدیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک و مفاسد کی جڑ بنیاد وہی تین بنیادی غلطیاں نکلیں گی جو زمانہ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل۔ ظلم اور غلامی۔ اور دوسرے لفظوں میں بد دیانتی اور بد سیاستی۔ اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کیلئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا۔ وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ

لا یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔ اس اُمت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے۔ جس سے اُمت کے اول کی اصلاح ہوئی۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ۔ جہل ظلم اور غلامی کو انکی تین اضداد علم احکام۔ عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں یہی تین اجزاء نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہی تین اجزاء کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلٰل مبین۔ وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال۔ آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جسکا تعلق قرآن کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے اُمت کی اصلاحی سکیم کے تین بنیادی اُصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم۔ جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر اُمت کے علم و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔ دوسرے مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لا کر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے۔ تیسرے مسئلہ تلقین حکمت۔ جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ اُمت کے سامنے لے آنے کے ہیں۔ جس کے مجموعہ پر اُمۃ کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام۔ پس قرآن کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اُصول ہو گئے۔ تعلیم احکام۔ تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے۔ دوسرے کا طریقت ہے اور تیسرے کا سیاست۔ گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت۔ شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت کیسے ممکن ہے؟ طریقت سے

اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے اگر رہروی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے۔ اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں اگر راستہ پر غار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائیگی منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے طریقت قوت رہروی ہے اور سیاست تصفیۂ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ

طریقت طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو چنانچہ وہ اپنے مبانی و اُصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعًا تخلی و خلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح و فلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انھیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے۔ بہر حال خلوت پسندی سے اوسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور ادا حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا۔ ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھسکر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کیجاتی ہے۔ شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے وہاں فرار عن الخلق ہے اور یہاں ذہاب الی الخلق پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر انکی اصلاح کی فکر میں رہیگا۔ اُسے درد ہوگا اپنے گھر کا پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا۔ پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست - ادہر سیاست کے دائرہ میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و مدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکلکر عباد تک آیا تھا۔ اور یہاں سیاست میں عباد سے نکلکر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحرا، و جبال زمینوں اور انکی پیداوار۔ دریاؤں اور اُن کے بھاؤ۔ حیوانات اور اُن کے منافع غرض ساری کائنات کے اجزا، اور انکی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود و قصاص الگ ہے اور جہاد و جانبازی الگ۔ احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سربلند کرنا مبطلوں کا زور توڑنا اور محقوں کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی و روحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈالکر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوۃ کہاں۔ یہاں تو عباد سے گذر کر بلاد۔ انسانوں سے گذر کر حیوانات، حیوانات سے گذر کر نباتات اور سب سے گذر کر ایک ایک چپۂ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کیجاتی ہیں۔ جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک

خاص دائرۂ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوۃ محض ہے۔ سیاست جلوۃ محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان میں ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوۃ در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوۃ کا مخزن (طریقت) ہو۔ اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار و دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ تو ان کے باہمی امتزاج کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پڑ جائے گی۔ اگر طریقت محض رہجائے جسمیں شریعت و سیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت و سیاست نہ ہو تو وہ شدۃ و جمود محض ہے اور اگر سیاست کیساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبر محض ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات منفرداً کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونیکی شان جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے۔ اور اسی لئے دین نے اون سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے۔ پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے جن کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اجتماعیت پر ہے۔ شریعت کے جمود و تقشف کا بدرقہ طریقت ہے جس سے قلب میں رافۃ و لینت پیدا ہو کر جمود و تشدد زائل ہوتا ہے۔ سیاست کی نخوت و تحکم کا بدرقہ شریعت و طریقت ہے جنکی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ اور خلافت آلہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کس مپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے۔ سیاست ہے جسکی ماوی شوکت ان دونوں کیلئے سرمایۂ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طرف طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہو گئی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہو گیا اور سیاست و قوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذ کی قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکلکر وقار و خود داری اور شہامت آ جائیگی۔ طریقت میں سے رسم خلوت نکلکر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اور ادہر اتباع شریعت میں سے خشکی و جمود تنگ نظری۔ اور تقشف نکلکر وسعت نظر جامعیت ہمہ گیری، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات اُبھر آئیں گے۔ جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائیگا۔ جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔ جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیکدم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کیجا رہی ہیں اور اُن کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح شریعت طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفیا اپنے تصوف کی تکمیل اسمیں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ ملکر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈالدیا ہے اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں۔ اور نہ صرف افراد ہی ملجائیں بلکہ انکے یہ تینوں فنون اس طرح باہم آمیختہ نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص۔ صوفی صافی اور سیاستی مخلص ہو جائے اسوقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل قوم ہی نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطہ نظر سے کامیابی کا مونھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو۔ علم احکام اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائیگا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہیگی نہ حقیقی دیانت۔ اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اک کٹ کھنا اور جبر و استبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہو جاویگی۔ قانون محض اور کوری سیاست ہی دنیا کبھی امن وچین کا منھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور نہ ہی عالم بشریۃ کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پرامن ہوتا کیونکہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینہ وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لئے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزآنہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں رقابتوں اور عداوتوں میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسناکی قانون کے دائرہ میں رہکر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم وستم خوب خوب سیکھتے جارہے ہیں۔ اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا و ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریۃ کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد آلٰہیہ کا علم ہے اور نہ اُن کا کوئی نمونۂ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اوتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔ پس آج کی یورپین تباہ کاریاں عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت و خواری۔ فقدان سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے۔ جب آدمی ایک بے شعور درندہ بنجائے۔ تو محض سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم و اخلاق بلا شوکت بے بس بے کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف اور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں انکی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساق و فجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں ان حالات

ہیں کہیں کھلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سنتہ سیئہ کو اور مضبوط بنادیتی ہیں ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقویٰ و تقدس کیطرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو۔ وہ بھی فجور کا غلبہ و استیلا ، دیکھکر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس و بے بس رہجاتا ہے جنمیں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آکر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت و راستبازی کی کمی نہیں بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیر تشنیع و ملامت ہے۔ مولوی کا غلط مذہب ، انتہائی ملا ازم ، تکفیر اہل حق ، ازالہ اثر اہل اللہ کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک بدعات ، محدثات ، منکرات و فواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترغیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے جب چاہے کھولدے اور جب چاہے بند کر دے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اسلئے ناپائدار اور غیر مستحکم ہے۔ کہ اسکی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات ، الحاد ، دہریت ، بے دینی ، شرک و بدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن و چین کا سانس نہیں لے سکتی۔ اسی لئے اسلام نے دین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنایا۔ جس سے دیانت و سیاست کا ایک ایسا حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہو گئی اور سیاست کا جور و استبداد دیانت سے پامال ہو گیا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

الملك والدين توامان۔ | ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے

ایک جگہ ارشاد ہے۔

بعثت مرحمة وملحمة۔ | میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ بنا کر بھی۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

انا الضّحوك القتال۔ | میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی ہوں

ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا۔

لایزال من اُمتی اُمَّۃً قَائمۃً بامر اللہ (ای الدین) حتی یاتی امر اللہ۔ (ای القیامۃ) | میری امت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی۔

الجهاد ماض الیٰ یوم القیمۃ

(میری امت میں، جہاد قیامت تک باقی رہیگا۔

قرآن نے نبوۃ کی بھی مدح سرائی کی جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرچشمہ ہے

واذ قال موسیٰ لقومہٖ یقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واٰتاکم مالم یؤت احدا من العالمین۔

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔

دین سیاسی نظام کی حیثیت میں

-اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں -کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، جہاد، اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب وارواح کی اصلاح ہو۔ اور اس سلسلہ میں عادات وعبادات اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا۔ جس سے بین الملی احوال درست ہوں۔ فتن کا استیصال ہو اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص۔ تعزیرات وکفارات جہاد اور سد ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔ اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ نگراں اور امام بنایا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی۔ نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ، امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا۔ وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاد کے بھی ہوگا۔ تاکہ اونکی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیۃ اللہ۔ خوف الٰہی۔ تقویٰ، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑکر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا وآخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھدی گئی ہے۔ تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی

-بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی اوپری چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے جنھوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ

سے الگ کر کے خدا سے ملانیکی صورت رکھی ہے ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھر بار اولاد بنیاد عزیز و اقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھکر یاد آلہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کیجا سکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت نا تمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہکر ادا حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا۔ اور اُسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی۔ پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہیں۔ اور مذہب و سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب و سیاست کی یہ تفریق ایسی ہی غلط ہے۔ جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہبوں کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس اُنہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جنھوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیۃ دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو۔ اُسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی ممد و معاون خادم ہے ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے البتہ اس سیاست کی معنی سیاست عنصریہ کے نہیں بلکہ سیاست شرعیہ کے ہیں۔ جس کی بنیاد علم و اخلاق تقویٰ و طہارت اور فضائل اعمال پر ہے۔ اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانیکے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ اونکی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے۔ جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کیجا سکتی۔ ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کے بقاء و استحکام کا ذریعہ اور وسیلہ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیے گئے۔ مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں۔ جیسے بنی اسرائیل وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ شاذ نادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی۔ مگر اصل دین تھا جو آپکی سلطنت کا محور و مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی۔ اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے

اس کی تصریح کی ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کا آرڈر دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض وغایت دیانات کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض وسماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سد راہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے۔ تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا۔ اور فتنۂ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم وجہل ہے۔ اور امانت مجموعۂ علم واخلاق انبیاء کا مقصد چونکہ امانت پھیلانا ہے۔ جس کی راہ میں یہ فتنہ مخل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا۔ اور یہ فتنہ یعنی ظلم وجہل جبکہ انسان میں جبلی تھا تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات وشہوات سے انھیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ وپند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی۔ پس سیاسی طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم واخلاق ونبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا تاکہ خلق خدا امن وسکون کے ساتھ اس علم وخلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت وعبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عنصری سیاست کا فرق

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج کی عنصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین۔ زر اور ذاتی اقتدار۔ آج کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چونکہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اُسے ملنا چاہیئے۔ یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام۔ قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہیئے۔ یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہیئے۔ ورنہ پھر جنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین۔ دوسری میں زر۔ اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے۔ جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے آج دنیا کی دو ثلث آبادی انہی تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں

بلکہ حرمت جنگ کی ہیں۔ کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین۔ کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کیلئے ہو ہی نہیں ہو سکتی یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور روزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ یا انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنیکا اُسے حق ہو۔ زمین کے بارہ میں ارشاد ربانی ہے۔

ان الارض لِلّٰہِ یورثھا من یشاء	بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے۔

یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے۔

انی جاعل فی الارض خلیفۃ ط	میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی۔ یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اسکی طرف سے نائب ہے اسکی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے ذاتی طور پر نہیں۔

مال کے بارہ میں فرمایا گیا۔

واتوھم من مال اللّٰہِ الذی اتاکم	اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے۔

یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے ذاتی موحیاتیے نہیں ایک جگہ فرمایا۔

وانفقوا مما رزقنٰکم	اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے۔

یہاں رازقیت اللہ کے لئے ثابت کیگئی ہے۔ جو اسکی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونیکی دلیل ہے۔

حکومت الٰہی ۔ اسی طرح حکومت و اقتدار اور انتداب کے بارہ میں فرمایا گیا کہ

ان الحکم الا اللّٰہ	حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔

اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر ہر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔

ایک جگہ فرمایا۔

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔	اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں۔ جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا۔ وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

اس میں آمریت صرف اللہ کیلئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے۔ بلکہ اوامر الٰہی کے بعد

بندہ کے چون وچرا، اور لم و کیف کی گنجائش بھی سلب کرلی گئی ہے یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔ قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت اور اقتدار و حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطۂ ملکیت میں آیا ہوا ہے اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو ان اغراض کیلئے کسی سیاسی جد و جہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہونچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کرینگے یا کسی قوم پر ہجوم کرینگے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد ۔ چنانچہ قرن اول کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہیئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ ورنہ اعلان جنگ ہے۔ بلکہ کسی رقبۂ زمین پر وجہ جواز جنگ کیلئے تین چیزیں پیش کیجاتی تھیں۔ یا تو خدا کا دین قبول کرلو یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ جو مجموعہ دیانت و سیاست اور چشمۂ علم و اخلاق ہے۔ یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرلو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آجاؤ۔ اور یہ اقوام پر اسلئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و سلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کرلو اور اپنے ملک میں آباد رہو ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض و غایت پس اسلامی جہاد۔ اور اسلامی سیاست یا اسکے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔ لتکون کلمة اللّٰه العلیاء۔

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد۔ اشاعت دین الٰہی۔ اقامت حکومت الٰہی حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کونسی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے ؟ کہ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اسکا مقاصد ہے۔ گر بزاگر ہو سکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ جبکہ انسان انسان اور اقوام اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے۔ یا اُسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کرکے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی بلکہ صرف اس لئے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو۔ اُسے ملک گیری اور طمع جاہ و مال سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ ہزار ملک فتح کرکے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار

کرتا ہے اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع وفساد بن سکتی ہے۔ لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے۔ جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کر دیا جائے

ایک لمحۂ غور و فکر اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت قومی اقتدار یا کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص نظام یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لیکر کھڑے ہونگے تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان وتسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پر سکون ہو جاتا ہے اور خود مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کرتے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت اعزاز نظام دین جنکا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔ تعلیم احکام۔ تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال۔ یعنی اتباع اسوۂ حسنہ۔ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائینگے۔ اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آجائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط وتنزل یا اقدامات میں جسقدر بھی ناکامی کے آثار کبھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی سبب اکثر وبیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہجانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔ یعنی ناکامی یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی عمر بن عبد العزیز کے بعد، جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا، مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں۔ پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زبردستی کے ایام آنے لگے۔ یہ محض اسی لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی یا رہی تو راہ مقصود نامعلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت باقی نہ رہی اور یادہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انھیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تین عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال تفصیلات کا موقع نہیں۔ لیکن اُصولی طور پر اب اس کے ماننے لینے

میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کی باگ ڈور بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاوی عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملک کی جہالت نا تربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ۔ ۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہیدؒ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے مگر تمام قوم کی لاعلمی اور نا تربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات۔ ۱۲۷۵ھ میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر بڑھ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہندؒ۔ ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہندؒ کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے۔ اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے ماتحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریض عمل اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے رفتار زمانہ نے انھیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے۔ اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انھیں عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، تنظیم حیات انسانی،

اشاعتِ دین الٰہی

تعلیم اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے - جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا - اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں - یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے - ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم - کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے - جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھکر مسلمان نونہالوں کو کتاب و سنت اور اسکے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں -

قاسمی علوم اور فلسفہ - میں اس میں یہ ضرور عرض کرونگا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھکر نئی ضروریات نظر انداز نہ کیجائیں اور انھیں سامنے رکھکر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اوتر سکیں -

مرکز علوم دار العلوم دیوبند - ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو - اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللٰہی کی حکمتوں کا نچوڑ - اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے تو یہ اسمیں داخل ہونے کا دروازہ ہے - یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چلکر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے - اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دار العلوم دیوبند ہے - ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجۃ اللّٰہ البالغہ اور تقریر دلپذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں -

مستقبل کا تعلیمی پروگرام - اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست، مبادیات سائنس، سیاسیات حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے اُن پر رائے زنی کر سکیں - بہر حال یہ کام مدارس کا ہے، قوم کی طرف سے اسکی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے - تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں - اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے -

مسجدی تعلیم - مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اسکی

ضرورت بھی ہے اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہونچ جائے - اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے - ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں ہی میں ہوں بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری ہیں مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کردیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کردیئے جائیں جو ضروریات دین عقائد فرائض، اخلاقیات، معاملات، ومعاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں -

درس قرآن - بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن عوام رہ جاتے ہیں - اسلئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہجائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو -

تبلیغ - لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب ومساجد کی بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لیکر جائیں - ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا - اس لئے اسی کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لیکر نکلیں - اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے - اور انبیاء علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے -

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت واکثریت کا فیصلہ کیا ہے مکہ میں کلیت کفار کی تھی - تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی - مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی - ابتداءً جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت - یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت واکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اسکا حل کر دیا - ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہو گئی - غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر واشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان مسلم وغیر مسلم کشاکشی سے نجات پاگئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھ بند کر لی گئی جو تبلیغ سے ممکن تھیں وہیں یہ کشمکش قائم ہے -

مسلم سلاطین کا قصور اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت واکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں، اور جنھوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں بلکہ باہم

مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطۂ اتحاد بہرحال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آیگا اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مایہ الاتحاد بنالیں اور ملکر متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہرحال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہی جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لیئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انھیں بنا لیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے۔ جو آئندہ دوسرے دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لیئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ انکی تبلیغ میں مؤثر ہونگی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علیٰ رب العلمین ۵	اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اُجرت نہیں چاہتا میرا اجر تو اللہ رب العلمین پر ہے۔

اس کے لیئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں جنکی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اُصول پر قائم کیا جائے اور اسکی تدریجی آمدنی میں اسکی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجتمند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے۔ جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانہ پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لیئے محافظ بنجائیگی۔

طریق تبلیغ - تبلیغ میں اُسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اُسے اُصولاً پیش کیا۔ یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب کے قاعدہ سے ہو اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے۔ پھر اپنے اہل بیت کو۔ پھر اہل قرابت کو پھر اہل شہر کو۔ پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔ یہ صورت اسی طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنادے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ خاموش طریق پر عملی شکل میں۔

تذکیر - اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے۔ یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاد دہانی کریں۔ موعظت و نصیحت کا بازار گرم ہو۔ کہ

وذکّر فانّ الذکریٰ تنفع المؤمنین | بار بار یاددہانی کرو کیونکہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی۔ مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہر صورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے۔ اور وہ مسلمانوں کو ان کی ماضی سے باخبر کرنا۔ اور ان کی شاندار روایات سلف سے اونھیں آشنا بنانا۔ جس کا مرکز و محور سیرۃ مقدسہ نبوی ہو۔ اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو سیرتیں ان کے دل و دماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کردیں گی۔ اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر آئے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متأثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم و تبلیغ اور درس و تذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ

"دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا"۔ اور "دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں"۔؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی۔ اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی۔ جن پر قابو پالینے کا راستہ بسہولت سامنے آسکیگا۔

عسکریت۔ ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس و مکاتب وغیرہ میں ایک اہم الاہم جزو کی اشاعت و ترویج بلکہ عملی مشق و ریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے مگر جسے آج کے عیش انزا، تمدن اور مخالف طاقتوں کی پوالیسیوں نے سست اور مضمحل بنادیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ سکھلائے جانے کی ضرورت ہے وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کما حقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈالکر صلح و جنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متأثر ہونے کے بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کونسا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر

مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفیعہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت ہے وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنھیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے۔ جسکی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے۔ جس سے قرآنی نظریات اُمت میں پھیل سکتے ہیں لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہی

تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم ۔ اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہو سکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ جبکہ اُن کے اپنے قلوب مزکّٰی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہوں۔

مسلمانوں کی تبلیغ اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کیریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق و عفاف للّٰہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھکر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام آنے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر ۔ مورخین لکھتے ہیں کہ صحابہ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گذرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہو جائے۔

ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم	خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلے

خانقاہیں پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنے اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ وریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا مشکل یہ ہو کہ آج کل خانقاہیں باستثنا رچند عامۃ دوکانداری کے اصول پہ قائم ہوگئی ہیں رسمی گدّیاں ہیں جس میں مریدوں سے تحصیل وصول کے سوا کسی تربیۃ کا کوئی کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دونگا کہ وہ اُن کے نذرانے بدستور قائم رکھکر کہ بہر حال اُن کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے کہ اُن کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو وہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ کی طرح اپنا شعار بنائیں اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔ اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بدنے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ مگر چونکہ یہ تعلیم باطن ہے اسلئے قرآن نے اُس کا نام تزکیہ رکھا ہے۔ اس کا مستقل کام تو خانقاہوں میں ہوسکتا ہے۔ لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے۔ جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا ہے خلاف شریعت امور دیکھکر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے۔ اور مخاطب کے دل کا راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال اگر سب کا شیوہ ہو جاوے تو ہر شخص دوسرے کے لئے ایک مستقل خانقاہ اور شیخ بن جائے گا۔ اور اسلامی اخوۃ کا حق ادا کرسکو گا۔ بہر حال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاح اخلاق ہے ورنہ اُس کی سیاست بھی اپنی حقیقی نتائج تک نہیں پہونچا سکتی یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ اُنھوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جدا گانہ بات ہے کہ انھوں نے طریق اصلاح میں الہام کے بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انھوں نے بھی نہیں دیکھا

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم بہر حال یہ ضروری شعبے اشاعۃ دین آلہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جنکی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔ قرآن نے ویعلمہم الکتاب سے تعلیم کی ضرورت۔ بلغ ما انزل الیک سے تبلیغ کی ضرورت وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین سے تذکیر کی ضرورت اور واعدوا لھم ما استطعتم سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم اور یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان سے تعلیم وصنعت وحرفت کی ضرورت جو آجکل سائنس کا عملی موضوع ہو ویز کیہم سے تصفیہ

باطن کی ضرورت وأمر بالمعروف ونھی عن المنکر سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور مبیّن الدین النصیح لکل مسلم سے جزائی جزئی روک ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کیلئے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے۔ جسپر صرف عمل ہی کی ضرورت رہجاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے ہاں پروگرام کیلئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کیلئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی

سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہوسکتی ہیں لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے اس نظریہ سے اختلاف وہی کرسکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو اسلئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع فقط اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹکر اس ایک پر جمع ہو جاویں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کیلئے اپنا مرنا اور جینا متعین کرے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اُس سے متحد بن جائینگے۔ ورنہ جس حد تک شرک آجائیگا اُسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہیگی کیونکہ مرکز قلوب واحد نہ رہیگا۔ اس لئے اُس کی واحد ذات اُسی کے واحد کلام اُسی کے واحد کعبہ اُسی کے واحد رسول کی طرف تمام امۃ کو علمی، اعتقادی اور علمی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم البشریۃ پر ایک اللہ کی حکومت قائم ہو جائے۔ بس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا کہ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جسکی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی (کتاب اللہ) کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق ہو کر اُس قانون پر چلنا اور اُسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے کیونکہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو اُس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہوسکتی اور نہ ہر شعبہ زندگی میں وہ مشعل راہ ہی بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کی ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اسی کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو۔ ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کردے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمنان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہریوں کی پادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوۃ کے بغیر طے نہ ہوسکیں گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جسکے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ یہ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکومت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح و طلاق تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر باہر جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اسی مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اسکے بالمقابل رواج کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت

آلہی کے ادعا کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع و رغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کا نام قانون آلہی سے بغاوت نہ رکھا جائے؟ پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعوے دار کس منہ سے ہو سکتی ہے۔؟

حکومت آلہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اُٹھائے جا سکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکّہ رواں ہو۔ مگر ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانی دارد

حفاظت نظام زندگی

آزادی

اس نصب العین (حکومت آلہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گذارنے کا ہے سو اُس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے۔ جو دلوں کی رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیونکہ غلامی کے جذبہ یا اُس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد ضمیر کو آزاد۔ اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت آلہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے ساری آزادیاں اُس میں پنہاں ہیں۔ آزادئ ضمیر کا پہلا قدم ہے۔ کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ وکفی باللہ حسیبا	یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کیلئے کافی ہے

پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔

لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم	

دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں۔

اشداء علی الکفار رحماء بینھم	کفار پر سخت اور آپس میں مہربان

بہر حال صلہ رحمی تعاون باہمی۔ ایثار و مروۃ۔ ہمدردی و محبت۔ غریبوں کی مدد چھوٹوں پر رحمت۔ بڑوں کی توقیر۔ علماء سے حیاء۔ ربانیوں کی تعظیم۔ اطعام طعام تحیۃ و سلام عبادت آلہی۔ شفقت علی الخلق۔ پڑوسیوں کی خبر گیری۔ یتامیٰ و مساکین کی اعانت۔ بیماروں کی عیادت۔ جنازوں کی مشایعت۔ مظلوموں کی دادرسی۔ ظالموں کی بیخ کنی۔ ادائے حقوق۔ دفع مظالم۔ سادگی و بے تکلفی۔ قناعۃ و زہد۔ حب آخرۃ۔ طلب حق۔ انصاف حق پرستی امت مرحومہ کے جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ۔ وہ ابواب ہیں جو اس اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں

ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی وتنظیم ہے۔

اس اسوۂ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہو جاتی ہے آزادئ مذہب، آزادئ ضمیر اور آزادئ علم وعمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امۃ ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوۃ سے امۃ کو منظم کرنا چاہیں تو اِسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لاکر باسانی کر سکتے ہیں کہ وہی اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں " اشاعۃ دین الہی" اور " اقامۃ حکومت الہی" کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اُسی طرح اُوج عروج پر پہونچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرونِ اُولیٰ میں پہونچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے۔ جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اُس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اُسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی

دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے۔ جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء جب سے کہ تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور اُن پر عمل درامد ہوا۔ جمعیتہ العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی رہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اُس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیتہ علماء ہند کے پچیس سال

اس دوران میں آج تک کونسی تحریک ہے جس میں جمعیتہ علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے سنہ ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہونچا دیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونکدی۔ اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ پر چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی جس نے شدھی کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور ساردا بل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا۔ ؟ کیا وہ جماعت جمعیتہ علماء ہند ہی کی نہ تھی۔

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی اُس کا نصب العین مستقل اُس کا نظام عمل مستقل تھا اسلئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھکر اُس نے رائے قایم کی۔ کسی ادارہ سے اُس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اُترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے امادہ ہے جو اُس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اِس پروانہ

پر اُس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بھی بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اُس کے کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جا رہی ہیں۔

بہر حال جمعیۃ العلماء کوئی آج کی جمعیۃ نہیں ہے اُس کی تشکیلات بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اُس کا قوام آج کے سارے ہی سیاسی اداروں سے قدیم ہے

جمعیۃ علماء ہند تاریخ کے آئینے میں جمعیۃ علماء ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو بعون اللہ حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعۃ کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالاکوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا۔ اور شہادۃ کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔ اِسی جماعۃ کے اکابر تھے جو ۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے۔ اور اُس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی۔ یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیونکہ ماضی و حال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیوبند حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اُس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے جہاں خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں ردائے شہادۃ اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہو سکتی ہیں جہاں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانیٔ دار العلوم دیوبند ۵۷ء کے پر آشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جا سکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جا سکتی ہے جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری۔ اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیۃ العلماء کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم و عمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا عبید اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگار ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر

گواہ ہے۔ آپ حضرات کا نازپروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر اُن مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لیکر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھکر اُٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونیکی امید میں گذار رہے ہیں۔ اُنہوں نے حجاز افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا روس کا انقلاب ماسکو پہونچکر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اُس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا مدنی شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیۃ العلماء کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں اس وقت آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں۔ اور آپ کے قلوب اُن کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں حضرت محترم اس وقت جمیعۃ العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلۂ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔ حضرت ممدوح اسوقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ بانی دار العلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکی کے مجاز۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ انکے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص و ایثار سے اُن کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے

حضرت مفتی اعظم ۔ اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم و تدبر کا روشن مینار ہیں جنکو دیکھکر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم انکی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پا لیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمیعۃ العلماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقعہ ہے۔ اور زمانہ انکی قدر یا بر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہر حال جمیعۃ العلماء کے رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے جسکی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہر حال جمعیۃ علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اُسی ساعت سے آزادی کیلئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے جب سے کہ مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی گو اسکی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب حال جدا جدا رہے آج کے دور میں اسکی وہی جدوجہد عسکری رنگ کے بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے بہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمیعۃ العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمیعۃ کے سامنے پیش کرنے کے لئے تاکہ ذمہ داران جمعیۃ اس پر غور و فکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ ۔ اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص۔ تعلیم عوام اور شہر و دیہات میں اس کی ہمہ گیری۔ درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ ہمسایۂ تذکیر و موعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں۔ نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ، فصل خصوصاً محکمۂ قضاء شرعی۔

حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوۂ حسنہ، توحید مطلب عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بدنظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائیگا۔ لیکن اسی چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اسکے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگراموں کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو۔ اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہوسکتا ہی۔ کیونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسرے انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہی۔ لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے اس نے تمام بنیادی ازم مثل نیشنلزم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے۔ جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں قومیں سب برابر تھیں۔ اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان انسان سب برابر تھے پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی؟ اور یکجائی تو وہ نوع و رعیت سے چل کیسی سکتی تھی۔ بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا۔ جس کا قانون اسلام اور یہ عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعۂ اتحاد مسلمانوں کیلئے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے اگر مسلمان خلوص دلی سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوت کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں کہ اختراعی اور جدل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہو اسکے چلانے کے لئے بہرحال جماعت اور اسکے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیۃ العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ ۔ کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا۔ اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اسکو پھل پھول لگے گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوا ایزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت مالویہ اور سوامی شردھانند نے اُسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لیجا کر غرق کر دیا۔

کانگریس کی تاسیس ۔ کانگریس کا قیام درحقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا۔ حکومت برطانیہ برطانیۂ عظمیٰ بننا چاہتی تھی اور اُسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی جو ہندوستا

کے انقلابی رجحانات کا رُخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کردے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز)، چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہوگئی۔ اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی

کانگریس ۱۹۱۶ء میں ۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اُسے زندگی دی نصب العین دیا۔ اور آزادی کا پرجوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے۔ تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہدیا جانا بیجا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کی سیاستی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس ترازو کے موجد کا کمال تھا۔ کہ اُسکے دونوں پلے نصف صدی گذرنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اسکی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلہ میں جو نام پیدا کیا مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں۔ مگر کما حقہ پھلوں کا فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ ۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریبان ہے یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہی ہے۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجودہ بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلہ میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جسکی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں دوسروں کے لئے اپنے پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہجاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جسمیں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف آج یہ جھولا پاکستان پر آکر رکا ہوا ہے۔

مسئلۂ پاکستان ۔ ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے۔ الہام نہیں ہے۔ دنیا میں جب کوئی اسکیم اُبھرتی ہے تو اسکو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم قلوب خلوص کیساتھ اسی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جنکا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جسکی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔ تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کرونگا کہ وہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اسکی تمام دفعات

واضح کردیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسی غور و بحث کیلئے پیش کردیں تاکہ جن مسلمانانِ ہندوستان کی فلاح و بہبود کیلئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اسکی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان ۔ ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کرونگا کہ جبکہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے۔ جب تک تمام ہندوستانی متحد نہ ہوجائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا انمول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کرسکیں اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انھیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کرلینا چاہئے۔ اگر فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائیگا اور اسے چلتا ہوا دیکھکر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار ہونا نہ پڑیگا اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے پیچھے معنیٰ کا کوئی ذخیرہ نہیں اور اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائیگا۔ محض آپکے مان لینے سے اسکی کوئی ہستی قائم نہیں ہوجائیگی۔ جب تک کہ خود اسکی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔ بہر حال یا اسکی توضیح و تشریح سامنے آئے تاکہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جاسکے اور یا اسکے ابہام و اجمال کے باوجود اسکی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کرکے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تاکہ منزل مقصود سامنے آئے اور اسکی حقیقت کو خود کھولنے کے بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھلکر یا دنیا کے سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہوجائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کردیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر بھی عرض کرونگا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان ہی پر عائد ہوگی۔ کیونکہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض انکی خاطر یا بوجہ اتحاد قبول کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع و ضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہوسکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کردیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بنا پر پھر بھی ذمہ داری انھیں پر ہے جو نہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھولکر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اسکے صحت و سقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلاشبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جسکا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہوسکیگا ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھولدینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور و فکر کریں مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھکر۔ لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہوجائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول و عدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جسکو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم ۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کرسکتی ہے جو مسلم قوم کی اسلامی تعمیر کی لائینوں سے ہمیشہ گذرتی رہی ہے جس نے اسوقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی رہنمائی کی جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس کیلئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کیجاسکتی تو سیاسی جہاد سے حاصل کیجاسکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیۃ العلماء کے اور کون ہے

جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو۔ اسلئے بھی کہ تجربہ اور عمل ہمیشہ اسکے ساتھ ہے اور اسلئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب سنت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور کتاب وسنت کے صحیح علم کیلئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں کہ وہ اس کے کھرے اور کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو اُن عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کردے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کر سکتی ہے۔ اس نے اب تک جسطرح دفاعی رنگ کی زرین خدمات انجام دی ہیں جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جا سکتا۔ اسیطرح اب بلحاظ وقت ومصالح وہ تعمیری کام کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیۃ علماء ہند کی قدر و قیمت - ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب وسنت کے اصول پر ہو اور پھر اُسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کیجائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پُرحوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للّٰہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھکر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں۔ یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں، جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہوئی اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیۃ علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل وعقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقعہ دیا کہ میں اپنے طالبعلمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے اُمت کا علمی میدان۔ یہ محض انکی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرۂ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آرہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص وللّٰہیت سے اُنکے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم۔ الا ان للہ ما فی السموات والارض۔ قد یعلم ما انتم علیہ ویوم یرجعون الیہ فینبئھم بما عملوا واللہ بکل شئ علیم ۝

محمد طیب غفرلہ مہتمم دار العلوم دیوبند ۱۵ اپریل ۱۹۴۲ء

جھولاً۔ | بڑا جاہل تھا۔

یعنی اس میں قوت علمیہ اور قوت عملیہ (اخلاق حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت اس میں علم اشیا، اور عدل خلاق کی استعداد تھی۔ جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوًا فى الارض ولا فسادًا والعاقبة للمتقين۔

یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو۔ اور فساد ضدِّ صلاح ہے اور صلاح ورشد کا فقدان وہی ظلم النفس ہے خواہ عملی ہو خواہ اخلاقی۔ پس آثار جہل وظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل وظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زبردستی پیدا کرسکتی ہے تو یہی ظلم و جہل۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کرکے اُسکی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے۔

واذ قال ربك للملائكة انى جاعلٌ فى الارض خليفة۔ قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپکے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤنگا زمین میں ایک نائب فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے۔ جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم

ادہر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم وجہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے۔

واذ تاذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيمة من يسومهم

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپکے رب نے یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلّط کرتا رہیگا

سوء العذاب -	جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہونچاتے رہیں گے -

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے - بہرحال ان آیات سے واضح ہوگیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں ظلم و جہل اور غلامی - اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئیگی -

عرب اقوام چودہ صدی قبل

آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انھیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں شمار کئے جانیکے قابل نہ رہیں - ادہکی تو بر تو جہالت نے تو اُن میں سے خیر و شر کی تمیز اُٹھادی اچھے بُرے کا فرق مٹادیا - حدود اشیا اُنکے قلوب پر مخفی ہوگئیں - وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے - مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مانکر انواع واقسام کے شرکوں میں بتلا تھے - بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد ہوگیا تھا - کعبۃ اللہ سیکڑوں بتوں کا بتخانہ تھا - جو انسانی زندگی کے مالک تصور کئے جاتے تھے - انھیں سے مرادیں مانگی جاتی تھیں - اُن ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور اس کے سامنے سر عبودیت خم کیا جاتا تھا - وہ نبی اور اُمتی کا فرق مٹا چکے تھے - رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دیدیا تھا - اور سنن انبیاء کو منکرات کا - دین اور غیر دین کی تمیز اُٹھ چکی تھی - دین کو غیر دین سمجھکر الحاد کا شکار تھے اور غیر دین کو دین جانکر بدعات و محدثات میں گرفتار -

ادہر ظلم اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاق فاضلہ کا اُن میں کوئی شمہ باقی نہ رہا تھا - اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار نہ تواضع، نہ بے نفسی نہ للّٰہیت نہ صبر نہ شکر، نہ اعتماد نہ توکل، ہاں رات دن کا شیوہ تھا - تفاخر و اترا ہٹ، بے رحمی و قساوت، شیخی و رعونت، کبر و نخوت سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسناکی و خودستائی اور ان بداخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا وہ لوٹ گھسوٹ، قتل و غارت، زنا و شراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں - جنھوں نے انکی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کرڈالا تھا -

ادہر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ انمیں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا نہ ملکی تمدن، نہ شہریت نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا - جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا بدویت و بربریت طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی - قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انھیں اُسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہونچادیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام کبھی غیروں کے گرفتار، اور کبھی خود اپنے شکار -

غرض ظلم و جہل نے ان میں سے آثار نبوت مٹادیئے تھے اور فوضویت و غلامی نے اُن میں سے آثار سلطنت محو

محو کر دیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی نہ سیاست۔ جس کا خون انہی تین امراض ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمت الٰہی کا ظہور علم نبوت مکارم اخلاق اسوۂ حسنہ آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل۔ تاریک پیکر۔ اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتاب جہانتاب چمکا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو۔ اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چنانچہ اپنی یہی تین شانیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں! ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

انما بعثت معلّمًا	میں بلاشبہ معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق	میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں

ایک جگہ آپ کے بارہ میں ارشاد الٰہی ہوا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃٌ	البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم و اخلاق و عمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپنے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود واشگاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا و ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے ان جائز اعمال کے دواعی دلوں میں اُبھریں۔ عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے ٹھیلنے یا اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گذرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمت حیات بخشی گئی ہے۔ اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت و استقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جسمیں مرکزیت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشر و اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت مادی و روحانی طاقت اور غلبہ و تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کر دے۔

بہر حال قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری)، خلق عادل (حکمۃ اخلاقی)، اسوۂ حسنہ (حکمۃ عملی)، جنھوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے اور حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انھوں نے دماغوں کو روشن کیا۔ اخلاق سے قلوب کو جگمگایا۔ اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا۔ اور ان تینوں روشن ہتیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ان تین طاقتوں کے ذریعہ سے خدا نے

اپنے قرآنی وعدہ کے مطابق اُن کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جما دیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی پہلے مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپ نے خراج لیا۔ اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم۔ مقوقس۔ بادشاہ مصر۔ نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضور کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیجکر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک کھلا تو لسانِ نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دور صدیقی میں خالد بن ولید کے دست حق پرست پر بہت سے بلاد فارس ابوعبیدہ کے ہاتھ پر متعدد بلاد شام۔ عمرو بن عاص کے ہاتھ پر کتنے ہی بلاد مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقی آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیار مصر، تمام اقلیم فارس اور روم و قسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے۔ دولت عثمانی کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی۔ زمین کے مشارق و مغارب تک یہ رو جا پہنچی۔ بلاد مغرب سے اقصاء اندلس قبرص۔ قیروان۔ بلاد سبتہ اور بحر محیط تک ادھر ناحیۂ مشرق سے اقصائے بلاد چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق و خراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو کر مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشینگوئی ارشاد فرمایا تھا کہ

ان اللہ زوی لی الارض فرأیت مشارقھا ومغاربھا وسیبلغ ملک اُمتی ما زوی لی منھا۔ (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۱)	اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے زمین کے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری اُمت کا ملک اس حد تک پہنچکر رہیگا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا بہت سے وہ ناحیئے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتوحات کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چنانچہ ہندوستان، افغانستان جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یوروپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم انکی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت و بر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں سے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ	وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا ہے تاکہ اُسکو تمام دینوں پر غالب کر دے (باعتبار حجۃ و دلیل بھی اور بلحاظ

وکفیٰ باللہ شہیداً۔ | شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرنِ اول میں ہوا کیفاً۔ اور قرن آخر میں ہوا کماً)

بہر حال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دستِ حق پرست پر ظاہر ہوئیں۔ جنھوں نے برکاتِ نبوت سے متبرک ہو کر اپنے ظلم کو عدل اخلاق سے۔ جہل کو علم نافع سے اور عمل کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال سے مستنیر کیا۔

زمانۂ جاہلیت آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہے جس کا قبل از بعثت نبوی چودہ صدی پیشتر تھی۔

وفورِ جہل وفورِ جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے جاتے ہیں اسی نسبت سے امت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے اصول اعتقادات تک میں شکوک و شبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں کسی کو خدا کے وجود ہی میں کلام ہے۔ کسی کو اس کی صفات میں۔ کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوۃ یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل و ثقہ ہونے میں۔ کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ۔ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں۔ اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے۔ اور کوئی سرے ہی سے اُسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلہ میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں۔ پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فیصدی ۹۹ علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی اینٹی ملاازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے کوئی مولوی کا غلط مذہب لکھکر اس روشنی ہی کو اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنیکی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ پس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری اس سے زیادہ مہلک مرض ہے۔ جو مسلمانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ اون پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟ اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے۔ اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک بھی مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی

ہوئی ہے اور اس سے جماعتی و اجتماعی طاقت میں روز بروز غلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدانِ اخلاق ادھر اخلاقی بے مائگی علمی تہیدستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسمی گدیاں اور تحصیل وصول کی چوکیاں بنکر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لیکر لوگ نکلیں سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائرِ دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لیکر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب و سنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھجاتی ہے سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے عادت و عبادت کی بدعات و محدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھکر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم رہجاتے ہیں نہ اُن میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال و کیفیات اور نہ اخلاقی مقامات و اقوال جلّی چھپی بد اخلاقیاں حسد و ریا کبر و حرص، اسراف و بخل، جبن و دوں ہمتی۔ جاہ پرستی و جاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ انکی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل و تتمیم جو مقصد نبوۃ تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اُصول کے بجائے نفسانی جذبات اور اُن کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول۔ نا اتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سر پھٹول۔ باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے آج اُمت اُس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی۔ اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص اُن کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامۃً قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع و جدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے توافق اور توافق کی راہ میں غمخواری۔ دوسروں کی دلداری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لئے شفقت و ایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمراتِ غلامی۔ ادھر مغلوبیت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال و خود داری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت میں ہے نہ معیشۃ، نہ تنظیم ہے۔ نہ قومی وحدت طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے۔ اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق و تحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقہ عمل کا بھی اختلاف آجاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع و جدال بنے بغیر نہیں رہتا پھر یہ اختلاف کسی اُصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء و قیاسات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اوسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید ہی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعہ نزاع و جدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت و سیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد۔ بہر حال قوم کا نظام علم و اخلاق جو مجموعۂ دیانت ہے

ایک طرف مختل ہے اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے دوسری طرف مضمحل ہے۔ اس لئے آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار دنیا نمایاں ہونے چاہیئں تھے وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ و جدل نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن و سکون گھروں شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا ہو چکا ہے، بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت صد درجہ ذلت و خواری اور بیسی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں۔ اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت و عیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اُسے آسمانی بم زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے نہ اُسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دھار فولادی بارش سے اُسے سنگوا لیتے ہیں، نہ اُسے سمندروں کے جگروں میں پناہ ہے کہ تار پیڈو تحت البحریاں اُسے اور زیادہ نہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات نباتات حیوانات سب اسکی دشمنی پر کمربستہ ہیں۔ پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے۔ تو طرح طرح کے امراض و مصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتی ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اُسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کیلئے نہ آج انسان کار آمد ہے۔ نہ غیر انسان جسکا حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں۔

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون۔	خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعضے اعمال کا مزہ اُنکو چکھا دے تاکہ وہ باز آجائیں۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم	اور جو کچھ بھی تمھیں دکھ پہونچتا ہے۔ سو وہ تمھارے ہی کرتوتوں کے سبب سے۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے یہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے۔ اور پورا خدائی کارخانہ۔ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اسنے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین نسوا الله فانساهم	اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو۔ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا

انفسہم اولئک ہم الفاسقون — سو اللہ نے خود انکی جانوں سے انھیں بھول میں ڈالدیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک و مفاسد کی جڑ بنیاد وہی تین بنیادی غلطیاں نکلیں گی جو زمانہ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل۔ ظلم اور غلامی۔ اور دوسرے لفظوں میں بددیانتی اور بدسیاستی۔ اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کیلئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا۔ وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کرسکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ

لا یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا۔ — اس اُمت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے۔ جس سے اُمت کے اول کی اصلاح ہوئی۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ۔ جہل ظلم اور غلامی کو انکی تین اضداد علم احکام۔ عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں یہی تین اجزاء نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لیے انہی تین اجزاء کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ — وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال — آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرماکر جسکا تعلق قرآن کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے اُمت کی اصلاحی سکیم کے تین بنیادی اُصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلۂ تعلیم۔ جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر اُمت کے علم و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔ دوسرے مسئلۂ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لاکر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے۔ تیسرے مسئلۂ تلقین حکمت۔ جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ اُمت کے سامنے لے آنیکے ہیں۔ جس کے مجموعہ پر اُمت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام — پس قرآن کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اُصول ہو گئے۔ تعلیم احکام۔ تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے۔ دوسرے کا طریقت ہے اور تیسرے کا سیاست ہے گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کی بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت — شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت کیسے ممکن ہے؟ طریقت سے

اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے اگر رہروی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے۔ اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں اگر راستہ پرخار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائیگی منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے طریقت قوت رہروی ہے اور سیاست تصفیۂ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ

طریقت طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو چنانچہ وہ اپنے مبانی و اُصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخلی و خلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے۔ اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح و فلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انھیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے۔ بہر حال خلوت پسندی سے اوسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور ادا حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا۔ ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھسکر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کیجاتی ہے۔ شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے وہاں فرار عن الخلق ہے اور یہاں ذھاب الی الخلق پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر انکی اصلاح کی فکر میں رہیگا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر کا پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا۔ پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست ۔ ادھر سیاست کے دائرہ میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و مدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکلکر عباد تک آیا تھا۔ اور یہاں سیاست میں عباد سے نکلکر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحرا، و جبال زمینوں اور انکی پیداوار۔ دریاؤں اور اُن کے بھاؤ۔ حیوانات اور اُن کے منافع غرض ساری کائنات کے اجزا، اور انکی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود و قصاص الگ ہے اور جہاد و جانبازی الگ۔ احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سربلند کرنا مبطلوں کا زور توڑنا اور محقوں کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی و روحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کرکے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈالکر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوۃ کہاں۔ یہاں تو عباد سے گذر کر بلاد۔ انسانوں سے گذر کر حیوانات، حیوانات سے گذر کر نباتات اور سب سے گذر کر ایک ایک چپۂ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کیجاتی ہیں۔ جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک

خاص دائرۂ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوۃ محض ہے۔ سیاست جلوۃ محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان میں ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوۃ در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوۃ کا مخزن (طریقت) ہو۔ اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ تو ان کے باہمی امتزاج کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پڑ جائے گی۔ اگر طریقت محض رہجائے جسمیں شریعت و سیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت و سیاست نہ ہو تو وہ شدۃ وجمود محض ہے اور اگر سیاست کیساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبر محض ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات منفرداً کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونیکی شان جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے۔ اور اسی لئے دین نے اون سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے۔ پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے جن کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اجتماعیت پر ہے۔ شریعت کے جمود و تقشف کا بدرقہ طریقت ہے جس سے قلب میں رافت و لینت پیدا ہو کر جمود و تشدد زائل ہوتا ہے۔ سیاست کی نخوت و تحکم کا بدرقہ شریعت و طریقت ہے جنکی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے۔ اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کس مپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے۔ سیاست ہے جسکی ماوی شوکت ان دونوں کیلئے سرمایۂ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طرف طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہو گئی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہو گیا اور سیاست و قوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذکی قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکلکر وقار و خود داری اور شہامت آجائیگی۔ طریقت میں سے رسم خلوت نکلکر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اور ادہر اتباع شریعت میں سے خشکی و جمود تنگ نظری۔ اور تقشف نکلکر وسعت نظر جامعیت ہمہ گیری، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات اُبھر آئیں گے۔ جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائیگا۔ جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔ جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیکدم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کیجارہی ہیں اور اُن کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جارہے ہیں۔ اور اس طرح شریعت طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفیاء اپنے تصوف کی تکمیل اسمیں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین منتقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ ملکر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئین حسن سے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈالدیا ہے اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں۔ اور نہ صرف افراد ہی ملجائیں بلکہ انکے یہ تینوں فنون اس طرح باہم آمیختہ نہ ہوجائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص۔ صوفی صافی اور سیاسئی مخلص ہوجائے اسوقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل قوم ہی نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطہ نظر سے کامیابی کا مونھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو۔ علم احکام اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علحدہ کیا جائیگا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہیگی نہ حقیقی دیانت۔ اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اک کٹ کھنا اور جور و استبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہوجاویگی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن وچین کا منھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور نہ ہی عالم بشریۃ کی اصلاح و تنظیم ہوسکتی ہے اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا کیونکہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینہ وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لئے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روز آنہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسنا کی قانون کے دائرہ میں رہکر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم و ستم خوب خوب سیکھتے جار ہے ہیں۔ اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا و ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریۃ کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ اُن کا کوئی نمونۂ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اوتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔ پس آج کی یورپین تباہ کاریاں عالم گیر بھونچال اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت و خواری۔ فقدان سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے۔ جب آدمی ایک بے شعور درندہ بنجائے۔ تو محض سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم و اخلاق بلا شوکت بے بس بے کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہوجانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف اور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں انکی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساق و فجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں ان حالات

ہیں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سنتہ سیئہ کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقوی و تقدس کیطرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو۔ وہ بھی فجور کا غلبہ و استیلا دیکھکر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس بے بس رہجاتا ہے جنمیں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آکر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کردیتی ہے غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کرکے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت و راستبازی کی کمی نہیں بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیر تشنیع و ملامت ہے۔ مولوی کا غلط مذہب، اتنٰی ملازم، تکفیر اہل حق، ازالۂ اثر اہل اللہ کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک بدعات، محدثات، منکرات و فواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترغیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے جب چاہے کھولدے اور جب چاہے بند کردے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائدار اور غیر مستحکم ہے۔ کہ اسکی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات، الحاد، دہریت، بے دینی، شرک و بدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم و اخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن و چین کا سانس نہیں لے سکتی۔ اسی لئے اسلام نے دین کی رہبانیت کو ختم کرکے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کرکے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنایا۔ جس سے دیانت و سیاست کا ایک ایسا حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جور و استبداد دیانت سے پامال ہوگیا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

الملك والدين توامان۔	ملک اور دین دو جوڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے
ایک جگہ ارشاد ہے۔	
بعثت مرحمة وملحمة۔	میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ بنا کر بھی۔
ایک جگہ ارشاد ہے۔	
انا الضحوك القتال۔	میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی ہوں

ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا۔

لایزال من اُمتی اُمَّۃٌ قَائِمَۃ بامر اللہ (ای الدین) یاتی امر اللہ۔ (ای القیامۃ)	میری امت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی۔

الجہاد ماض الی یوم القیمۃ (میری امت میں، جہاد قیامت تک باقی رہیگا۔

قرآن نے نبوۃ کی بھی مدح سرائی کی جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا منشاء ہے

واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا واتاکم مالم یؤت احدا من العالمین۔

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔

دین سیاسی نظام کی حیثیت میں

۔اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں۔کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے۔جماعت، سمع، طاعت، ہجرت جہاد، اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب وارواح کی اصلاح ہو۔اور اس سلسلہ میں عادات وعبادات اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا۔جس سے بین الملی احوال درست ہوں۔فتن کا استیصال ہو اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص۔تعزیرات وکفارات جہاد اور سد ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔اسلام نے امیر المؤمنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ نگراں اور امام بنایا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی۔نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ، امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔اس لئے امیر المؤمنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا۔وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاد کے بھی ہوگا۔تاکہ انکی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیۃ اللہ۔خوف الٰہی۔تقویٰ، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑکر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا وآخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھدی گئی ہے۔تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی

۔بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں، نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی اوپری چیز ہے۔یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے جنھوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ

سے الگ کر کے خداسے ملائیکی صورت رکھی ہے ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھر باہر اولاد بنیاد عزیز و اقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھکر یاد آہی میں مشغول ہو ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کیجا سکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہکر ادا حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا۔ اور اُسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی۔ پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہیں۔ اور مذہب و سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب و سیاست کی یہ تفریق ایسی ہی غلط ہے۔ جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہبوں کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس اُنہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جنھوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیۃ دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو۔ اُسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی ممد و معاون خادم ہے ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے البتہ اس سیاست کی معنی سیاست عنصریہ کے نہیں بلکہ سیاست شرعیہ کے ہیں۔ جس کی بنیاد علم و اخلاق تقوی و طہارت اور فضائل اعمال پر ہے۔ اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانیکے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ اونکی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے۔ جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کیجا سکتی۔ ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کے بقاء و استحکام کا ذریعہ اور وسیلہ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیے گئے۔ مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں۔ جیسے بنی اسرائیل وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ شاذ نادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی۔ مگر اصل دین تھا جو آپکی سلطنت کا محور و مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی۔ اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے

اس کی تصریح کی ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کے کرنے کا آرڈر دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض و غایت دیانات کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے سلطنت کا اُن اُمور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض و سماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سدراہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔ علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے۔ تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا۔ اور فتنۂ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے۔ اور امانت مجموعۂ علم و اخلاق انبیاء کا مقصد چونکہ امانت پھیلانا ہے۔ جس کی راہ میں یہ فتنہ اخلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا۔ اور یہ فتنہ یعنی ظلم و جہل جبکہ انسان میں جبلی تھا تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات و شہوات سے انھیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی۔ پس سیاسی طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور اُن میں علم و اخلاق دونوں پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا تاکہ خلق خدا امن و سکون کے ساتھ اس علم۔ خلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت و عبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عنصری سیاست کا فرق

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہوسکتا جو آج کی عنصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین۔ زر اور ذاتی اقتدار۔ آج کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چونکہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہذا اُسے ملنا چاہیے۔ یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام۔ قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہیے۔ یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا استداب قائم ہونا چاہیے۔ ورنہ پھر جنگ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین۔ دوسری میں زر۔ اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے۔ جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجۃ سمجھ لیا جاتا ہے آج دنیا کی دو ثلث آبادی انہی تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں

بلکہ حرمت جنگ کی ہیں ۔کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین ۔ کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کیلئے ہو ہی نہیں ہو سکتی یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور روزنی ہیں ۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ یا انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنیکا اُسے حق ہو ۔ زمین کے بارہ میں ارشاد ربانی ہے ۔

ان الارض لِلّٰہِ یورثھا من یشاء	بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے ۔

یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے ۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے ۔
ایک جگہ ارشاد ہے ۔

انی جاعل فی الارض خلیفۃ ط	میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی ۔ یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اسکی طرف سے نائب ہے اسکی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے ذاتی طور پر نہیں ۔
مال کے بارہ میں فرمایا گیا ۔

واتوھم من مال اللّٰہِ الذی اٰتاکم	اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے ۔

یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے ۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے ذاتی موجبات سے نہیں ایک جگہ فرمایا ۔

وانفقوا مما رزقنٰکم	اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے ۔

یہاں رازقیت اللہ کے لئے ثابت کیگئی ہے ۔ جو اسکی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونیکی دلیل ہے ۔

حکومت الٰہی ۔ اسی طرح حکومت و اقتدار اور انتداب کے بارہ میں فرمایا گیا کہ

ان الحکم الا اللّٰہ	حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں ۔

اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر ہر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے ۔
ایک جگہ فرمایا ۔

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالًا مبینًا ۔	اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے ۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا ۔ وہ صریح گمراہی میں پڑا ۔

اس میں آمریت صرف اللہ کیلئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے ۔ بلکہ اوامر الٰہی کے بعد

بندہ کے چون وچرا، اور کم و کیف کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔ قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت اور اقتدار و حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطۂ ملکیت میں آیا ہوا ہے اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو ان اغراض کیلئے کسی سیاسی جد و جہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہونچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کرینگے یا کسی قوم پر ہجوم کرینگے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد ۔ چنانچہ قرن اول کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہیئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ ورنہ اعلان جنگ ہے۔ بلکہ کسی رقبۂ زمین پر وجہ جواز جنگ کیلئے تین چیزیں پیش کیجاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کرو یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ جو مجموعۂ دیانت و سیاست اور چشمۂ علم و اخلاق ہے۔ یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آجاؤ۔ اور یہ اقوام پر اسلئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و سلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کر لو اور اپنے ملک میں آباد رہو ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض و غایت پس اسلامی جہاد۔ اور اسلامی سیاست یا اسکے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔ لتکون کلمۃ اللہ العلیاء۔

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد۔ اشاعت دین الٰہی۔ اقامت حکومت الٰہی حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کونسی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے؟ کہ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اسکا مقاصد ہے۔ گریز اگر ہو سکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ جبکہ انسان انسان اور اقوام اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے۔ یا اُسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کر کے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی بلکہ صرف اس لئے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو۔ اُسے ملک گیری اور طمع جاہ و مال سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ ہزار ملک فتح کر کے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں، بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار

کرتا ہے اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع وفساد بن سکتی ہے۔ لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے۔ جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کردیا جائے

ایک لمحہ غور وفکر اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت قومی اقتدار یا کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص تنذاب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لیکر کھڑے ہونگے تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان وتسلی ہو تو ہر اقدام پُرکیف اور پُرسکون ہو جاتا ہے اور خود مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت اعزاز نظام دین جنکا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔ تعلیم احکام۔ تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال۔ یعنی اتباع اسوۂ حسنہ۔ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائینگے۔ اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب نظر آجائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط وتنزل یا اقدامات میں جسقدر بھی ناکامی کے آثار کبھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی سبب اکثر وبیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہنا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے یعنی ناکامی یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی عمر بن عبد العزیز کے بعد جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا، مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رُکیں۔ پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زیردستی کے ایام آنے لگے۔ یہ محض اسی لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی یا نہ ہی تو راہ مقصود نامعلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت باقی نہ رہی اور زیادہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم وخلق سے اسی مقررہ نظام پر انھیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تین عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال تفصیلات کا موقع نہیں۔ لیکن اصولی طور پر اب اس کے ماننے لیجئے

میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہندوستان کی باگ ڈور بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تینوں عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تینوں بنیادوں میں نقصان آیا تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملک کی جہالت ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک ہمیشہ ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ۔ ۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہیدؒ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ کی قیادت میں اُٹھے بڑھے اور شہید بھی ہوئے مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزا ذریعہ شکست بنگئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات ۔ ۱۲۷۵ھ میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی قیادت میں اوٹھے اور فتوحات کی لائن پر بڑھ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہندؒ ۔ ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہندؒ کھلکر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے۔ اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے ماتحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریض عمل اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے رفتار زمانہ نے انھیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اُٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے۔ اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں اُنھیں عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، تنظیم حیات انسانی،

اشاعتِ دینِ الٰہی

تعلیم اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔ جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔ کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھکر مسلمان نونہالوں کو کتاب و سنت اور اسکے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ ۔ میں اس میں یہ ضرور عرض کرونگا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھکر نئی ضروریات نظر انداز نہ کیجائیں اور انھیں سامنے رکھکر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پُرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اوتر سکیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیوبند ۔ ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو۔ اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللّٰہی کی حکمتوں کا نچوڑ۔ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے تو یہ اسمیں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چلکر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔ اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند ہے۔ ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجۃ اللّٰہ البالغہ اور تقریر دلپذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام ۔ اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست، مبادیات سائنس، سیاسیات حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرۃ پیدا کر کے صحیح طور سے اُن پر رائے زنی کر سکیں۔ بہر حال یہ کام مدارس کا ہے، قوم کی طرف سے اسکی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں۔ اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم ۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اسکی

ضرورت بھی ہے اس لئے مدارس کی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہونچ جائے - اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے - ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں ہی میں ہوں بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری ہیں مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کردیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسائے داخل درس کردیئے جائیں جو ضروریات دین عقائد فرائض، اخلاقیات، معاملات، ومعاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں -

درس قرآن - بہرحال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن عوام رہ جاتے ہیں - اسلئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہجائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو -

تبلیغ - لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب و مساجد کی بہرحال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لیکر جائیں - ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا - اس لئے اسی کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لیکر نکلیں - اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے - اور انبیاء علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے -

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت واکثریت کا فیصلہ کیا ہے مکہ میں کلیت کفار کی تھی - تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی - مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی - ابتداءً جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت - یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت واکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اسکا حل کردیا - ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہوگئی - غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر واشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان مسلم وغیر مسلم کشاکشی سے نجات پاگئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھ بند کرلی گئی جو تبلیغ سے ممکن تھیں وہیں یہ کشمکش قائم ہے -

مسلم سلاطین کا قصور اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت واکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنھوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں بلکہ باہم

مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطۂ اتحاد بہرحال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئیگا اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور ملکر متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہرحال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہی جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انھیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملّت کا آغاز کر دیا جائے۔ جو آئندہ دوسرے دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈالدے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ انکی تبلیغ میں مؤثر ہونگی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین ۵	اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اُجرت نہیں چاہتا میرا اجر تو اللہ رب العلمین پر ہے۔

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں جنکی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اُصول پر قائم کیا جائے اور اسکی تدریجی آمدنی میں اسکی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے۔ جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانہ پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بنجائیگی۔

طریق تبلیغ ۔ تبلیغ میں اُسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اُسے اُصولاً پیش کیا۔ یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب کے قاعدہ سے ہو اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے۔ پھر اپنے اہل بیت کو۔ پھر اہل قرابت کو پھر اہل شہر کو۔ پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔ یہ صورت اسی طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنادے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہیئے بلکہ خاموش طریق پر عملی شکل میں۔

تذکیر ۔ اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے۔ یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاد دہانی کریں۔ موعظت و نصیحت کا بازار گرم ہو۔ کہ

وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین | بار بار یاددہانی کرو کیونکہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی۔ مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہر صورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے۔ اور وہ مسلمانوں کو اون کی ماضی سے باخبر کرنا۔ اور ان کی شاندار روایات سلف سے اونھیں آشنا بنانا۔ جس کا مرکز و محور سیرۃ مقدسہ نبوی ہو۔ اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو سیرتیں اون کے دل و دماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی۔ اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر آئے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم و تبلیغ اور درس و تذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ

"دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا"۔ اور "دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں"؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی۔ اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی۔ جن پر قابو پالینے کا راستہ بسہولت سامنے آسکیگا۔

عسکریت۔ ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس و مکاتب وغیرہ میں ایک اہم الاہم جز کی اشاعت و ترویج بلکہ عملی مشق و ریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے مگر جسے آج کے عیش انگیز تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور مضمحل بنا دیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ سکھلائے جانے کی ضرورت ہے وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کما حقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈالکر صلح و جنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کے بجائے اونکی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کونسا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس طرح بر

مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفیعہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت ہے وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنھیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہو سکتی ہے۔ جسکی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے۔ جس سے قرآنی نظریات اُمت میں پھیل سکتے ہیں لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہی

تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم ۔ اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہو سکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدوّن ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ جبکہ اُن کے اپنے قلوب مزکّٰی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہوں۔

مسلمانوں کی تبلیغ اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کیریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق و عفاف، للّٰہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھکر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام آنے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر ۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گذرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہو سکتے"!

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر بھی دفع ہو جائے۔

ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم	خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلے

خانقاہیں پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنے اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ وریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند عامتہً دوکانداری کے اصول پر قائم ہوگئی ہیں رسمی گدّیاں ہیں جس میں مریدوں سے تحصیل وصول کے سوا کسی تربیۃ کا کوئی کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کرکے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اُس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دونگا کہ وہ اُن کے نذرانے بدستور قائم رکھکر کہ بہر حال اُن کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے کہ اُن کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کرکے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ کی طرح اپنا شعار بنائیں اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔ اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بدنے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ مگر چونکہ یہ تعلیم باطن ہے اسلئے قرآن نے اُس کا نام تزکیہ رکھا ہے۔ اس کا مستقل کام تو خانقاہوں میں ہو سکتا ہے۔ لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے۔ جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا ہے خلاف شریعت امور دیکھکر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے۔ اور مخاطب کے دل کا راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال اگر سب کا شیوہ ہو جاوے تو ہر شخص دوسرے کے لئے ایک مستقل خانقاہ اور شیخ بن جائے گا۔ اور اسلامی اخوۃ کا حق ادا کر سکے گا۔ بہر حال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاح اخلاق ہے ورنہ اُس کی سیاست بھی اپنی حقیقی نتائج تک نہیں پہونچا سکتی یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ اُنھوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ اُنھوں نے طریق اصلاح میں الہام کے بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انھوں نے بھی نہیں دیکھا

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم بہر حال یہ ضروری شعبے اشاعۃ دین الٰہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جنکی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔ قرآن نے ویعلمہم الکتاب سے تعلیم کی ضرورت۔ بلغ ما انزل الیک سے تبلیغ کی ضرورت وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین سے تذکیر کی ضرورت اور واعدوا لہم ما استطعتم سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم اور یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل وجفان سے تعلیم وصنعت وحرفت کی ضرورت جو آجکل سائنس کا عملی موضوع ہے ویزکیہم سے تصفیہ

باطن کی ضرورت و امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت صبغۃ الدین النصیحۃ لکل مسلم سے جزائی جزئی روک ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے۔ جسپر صرف عمل ہی کی ضرورت رہجاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے ہاں پروگرام کیلئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کیلئے کوئی نظری مرکز پیدا ہوجائے اور وہ یکسو ہوکر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی

سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہوسکتی ہیں لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے اس نظریہ سے اختلاف وہی کرسکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو اسلئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع فقط اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹکر اس ایک پر جمع ہوجاویں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہورہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کیلئے اپنا مرنا اور جینا متعین کرلے تو وہ سب سے متحد ہوجائے گا اور سب اُس سے متحد بن جائینگے۔ ورنہ جس حد تک شرک آتا جائیگا اُسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہیگی کیونکہ مرکز قلوب واحد نہ رہیگا۔ اس لئے اُس کی واحد ذات اُسی کے واحد کلام اُسی کے واحد کعبہ اُسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریۃ پر ایک اللہ کی حکومت قائم ہوجائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا کہ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جسکی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی (کتاب اللہ) کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق ہوکر اُس قانون پر چلنا اور اُسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے کیونکہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو اُس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہوسکتی اور نہ ہر شعبہ زندگی میں وہ مشعل راہ ہی بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کی ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اسی کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو۔ ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کرے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمنان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہریوں کی پاؤڈری سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوۃ کے بغیر طے نہو سکیں گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جسکے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ یہ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکومت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح و طلاق تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر باہر جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اسی مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اسکے بالمقابل رواج کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت

آلہی کے ادعا کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع و رغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون آلہی سے بغاوت نہ رکھا جائے؟ پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو وہ حکومت الہی کے عنوان کی دعوے دار کس منہ سے ہو سکتی ہے۔؟

حکومت آلہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اُٹھائے جا سکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانی دارد

حفاظت نظام زندگی

آزادی اس نصب العین (حکومت آلہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گذارنے کا ہے سو اُس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے۔ جو دلوں کی ہر گ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیونکہ غلامی کے جذبہ یا اُس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد ضمیر کو آزاد۔ اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت آلہی کا عملی نمونہ اور ایک گی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے ساری آزادیاں اُس میں پنہاں ہیں۔ آزادئ ضمیر کا پہلا قدم ہے۔ کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رُعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ وکفی باللہ حسیبا | یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کیلئے کافی ہے

پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔

لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم |

دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں۔

اشداء علی الکفار رحماء بینھم | کفار پر سخت اور آپس میں مہربان

بہر حال صلہ رحمی۔ تعاون باہمی۔ ایثار و مروۃ۔ ہمدردی و محبت۔ غریبوں کی مدد چھوٹوں پر رحمت۔ بڑوں کی توقیر۔ علماء سے حیا۔ ربانیوں کی تعظیم۔ اطعام طعام تحیۃ وسلام عبادت آلہی۔ شفقت علی الخلق۔ پڑوسیوں کی خبر گیری۔ یتامیٰ و مساکین کی اعانت۔ بیماروں کی عیادت۔ جنازوں کی مشایعت۔ مظلوموں کی داد رسی۔ ظالموں کی بیخ کنی۔ ادائے حقوق۔ دفع مظالم۔ سادگی و بے تکلفی۔ قناعۃ و زہد۔ حب آخرۃ۔ طلب حق۔ انصاف حق پرستی امت مرحومہ کے جامع مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ۔ وہ ابواب ہیں جو اس اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں

ہیں اور جن کا ثمرہ یں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوۂ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہوجاتی ہے آزادیٔ مذہب، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ علم و عمل حاصل ہوجاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امۃ ہی ہوسکتے ہیں اپنی جماعتی قوۃ سے امۃ کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لاکر بآسانی کر سکتے ہیں کہ وہی اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں "اشاعۃ دین الٰہی" اور "اقامۃ حکومت الٰہی" کی عرض کردہ دفعات شامل کرلی جائیں تو قوم اُسی طرح اَوج عروج پر پہونچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرونِ اُولیٰ میں پہونچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے۔ جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اُس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اُسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی

دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے۔ جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء جب سے کہ تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور اُن پر عمل درآمد ہوا۔ جمعیۃ العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی رہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اُس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے پچیس سال

اس دوران میں آج تک کونسی تحریک ہے جس میں جمعیۃ علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے سنہ ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہونچادیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونکدی۔ اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ پر چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی جس نے شدھی کی تحریک۔ سنگھٹن کے ہنگاموں نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور ساردا بل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا۔؟ کیا وہ جماعت جمعیۃ علماء ہند ہی کی نہ تھی۔

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی اُس کا نصب العین مستقل اُس کا نظام عمل مستقل تھا اسلئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر رکھکر اُس نے رائے قایم کی۔ کسی ادارہ سے اُس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہوسکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اُترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے جو اُس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اِس پروانہ

پر اُس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بھی بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اُس کے کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جارہی ہیں۔

بہر حال جمعیتہ العلماء کوئی آج کی جمعیتہ نہیں ہے اُس کی تشکیلات بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اُس کا قوام آج کے سارے ہی سیاسی اداروں سے قدیم ہے

جمعیتہ علماء ہند تاریخ کے آئینے میں جمعیتہ علماء ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو بعون اللہ حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعۃ کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالاکوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا۔ اور شہادۃ کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔ اِسی جماعۃ کے اکابر تھے جو ۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے۔ اور اُس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی۔ یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیونکہ ماضی و حال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیوبند حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اُس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے جہاں خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادۃ اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہی وہ ویران بستیاں فراموش ہو سکتی ہیں جہاں حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانیٔ دار العلوم دیوبند ۵۷ء کے پر آشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جا سکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جا سکتی ہے جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری۔ اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیتہ العلماء کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم و عمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا عبید اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگار ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر

گواہ ہے۔ آپ حضرات کا نازپروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر اُن مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لیکر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھکر اُٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونیکی امید میں گذار رہے ہیں۔ اُنہوں نے حجاز افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا روس کا انقلاب ماسکو پہونچکر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اُس سارہی سیاستہ کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علمار کے وجود کو ختم کردینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا مدنی شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیۃ العلمار کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں اس وقت آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں۔ اور آپکے قلوب اُن کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج مینی جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں حضرت محترم اس وقت جمعیۃ العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلۂ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔ حضرت ممدوح اسوقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ بانی دار العلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکی کے مجاز۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ انکے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے جذبۂ اخلاص و ایثار سے اُن مخالف بھی انکار نہیں کر سکتی

حضرت مفتی اعظم ۔ اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم و تدبر کا روشن مینار ہیں جنکو دیکھکر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم انکی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پالیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیۃ العلماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقعہ ہے۔ اور زمانہ انکی قدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال جمعیۃ العلماء کے رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے جسکی ابتدا حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ہیں اور انتہا ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہرحال جمعیۃ علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اُسی ساعت سے آزادی کیلئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے جب سے کہ مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی گو اسکی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب حال جدا جدا رہے آج کے دور میں اسکی وہی جدوجہد عسکری رنگ کے بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک رفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیۃ العلماء کا پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیۃ کے سامنے پیش کرنے کے لئے تاکہ ذمہ داران جمعیۃ اس پر غور و فکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ - اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص - تعلیم عوام اور شہر و دیہات میں اس کی ہمہ گیری - درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر و موعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ، فصل خصوصاً محکمۂ قضا و شرعی۔

حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوۂ حسنہ، توحید مطلب عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بدنظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ - میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائیگا - لیکن اسے چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اسکے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگراموں کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو - اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے - ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے - کیونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسرے انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے - لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں - اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے اس نے تمام بنیادی ازم مثل نیشنلزم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے - جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں - اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں قومیں سب برابر تھیں - اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان انسان سب برابر تھے پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی؟ اور یکجائی تو وہ نوع رعیت سے چل کیسی سکتی تھی - بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا - جس کا قانون اسلام اور یہ عرض کردہ پروگرام ہے - پس اس سے بہتر ذریعۂ اتحاد مسلمانوں کیلئے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے اگر مسلمان خلوص دلی سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوت کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں کہ اختراعی اور جدل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں - لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں ہو اسکے چلانے کے لئے بہر حال جماعت اور اسکے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیۃ العلماء پر -

کانگریس اور لیگ - کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں - کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا - اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا - خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اسکو پھل پھول لگے گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوا ایزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت مالویہ اور سوامی شردھانند نے اُسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لیجا کر غرق کر دیا -

کانگریس کی تاسیس - کانگریس کا قیام درحقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا - حکومت برطانیہ برطانیۂ عظمیٰ بننا چاہتی تھی اور اُسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی جو ہندوستا

کے انقلابی رجحانات کا رُخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کردے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز)، چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہوگئی۔ اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی

کانگریس ۱۹۱۶ء میں ۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اُسے زندگی دی نصب العین دیا۔ اور آزادی کا پرجوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے۔ تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہدیا جانا بیجا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کی سیاستی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس ترازو کے موجد کا کمال تھا۔ کہ اُسکے دونوں پلے نصف صدی گذرنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لیے جو کچھ جدوجہد کی ہے اسکی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلہ میں جو نام پیدا کیا مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں۔ مگر کماحقہ پھلوں کا فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ ۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہوکر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریباں ہے۔ یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہی ہے۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجودہ بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلہ میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جسکی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں دوسروں کے لئے اپنے پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہجاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جسمیں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف آج یہ جھولا پاکستان پر آکر رکا ہوا ہے۔

مسئلۂ پاکستان ۔ ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے۔ الہام نہیں ہے۔ دنیا میں جب کوئی اسکیم اُبھرتی ہے تو اسکو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کردیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کرلی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم قلوب خلوص کیساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جنکا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جسکی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔ تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کرونگا کہ وہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرماکر اسکی تمام دفعات

واضح کردیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسی غور و بحث کیلئے پیش کردیں تاکہ جن مسلمانان ہندوستان کی فلاح و بہبود کیلئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اسکی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں

مخالفین پاکستان ۔ ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کرونگا کہ جبکہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے جب تک تمام ہندوستانی متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا انمول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کرسکیں اس پاکستان کے ماننے ہی سے ملسکتا ہے تو انھیں بلاکسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کرلینا چاہئے۔ اگر فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائیگا اور اسے چلتا ہوا دیکھکر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار ہونا نہ پڑیگا اور اگر یہ لفظی لفظ ہے جس کے پیچھے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں اور اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائیگا محض آپکے مان لینے سے اسکی کوئی ہستی قائم نہیں ہو جائیگی جب تک کہ خود اسکی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔ بہر حال یا اسکی توضیح و تشریح سامنے آئے تاکہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جاسکے اور یا اسکے ابہام و اجمال کے باوجود اسکی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کرکے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تاکہ منزل مقصود سامنے آئے اور اسکی حقیقت کو خود کھولنے کے بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھلکر یا وبال کے سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہو جائے محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بناکر آگے بڑھنے کا راستہ بند کردیا جانا خواہ منوانیکی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ہٹ کے ساتھ سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر بھی عرض کرونگا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان ہی پر عائد ہوگی۔ کیونکہ اگر پاکستان کو اس ابہام کی ساتھ محض انکی خاطر یا بوجہ لاتنخاف قبول کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع و ضرر کے وہی ذمہ دار ہو سکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کردیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بنا پر بھی ذمہ داری انھیں پر ہے جو نہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھولکر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اسکے صحت و سقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلاشبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک ہوتی ہے جسکا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہو سکیگا ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھولدینے یا گول ہی منوانے کے اصرار پر مزید غور و فکر کرلیں مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھکر۔ لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہو جائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول و عدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جسکو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم ۔ اس لئے ناگزیر طریقہ پر شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کرسکتی ہے جو مسلم قوم کی اسلامی تعمیر کی لائینوں سے ہمیشہ گذرتی رہی ہے جس نے اسوقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی رہنمائی کی جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس کیلئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کیجا سکتی تو سیاسی جہاد سے حاصل کیجاسکتی ہے ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیۃ العلماء کے اور کون ہے

جوان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اسلئے بھی کہ تجربہ اور عمل بہم اسکے ساتھ ہے اور اسلئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب و سنت کے سوا - اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور کتاب و سنت کے صحیح علم کیلئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں کہ وہ اس کے کھرے اور کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو اُن عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کردے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کر سکتی ہے - اس نے اب تک جسطرح دفاعِ ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں جنھیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جا سکتا - اسیطرح اب بلحاظ وقت و مصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیۃ علماء ہند کی قدر و قیمت

- ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب و سنت کے اصول پر ہو اور پھر اُسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کیجائے - بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع دواعی سے زیادہ ہیں - لیکن جبکہ اس پُر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھکر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں - یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی ہے - کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہوئی اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے - وما ذلك على الله بعزيز۔

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیۃ علماء صوبۂ سندھ کے مقدس ارباب حل و عقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقعہ دیا کہ میں اپنے طالبعلمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے اُمت کا علمی میدان - یہ محض انکی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرۂ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آرہا ہے -

گدا بہ تخت نشانند و بادشہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للہیت سے اُنکے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب
اليم الا ان لله ما في السموات والارض - قد يعلم ما انتم عليه
ويوم يرجعون اليه فينبئهم بما عملوا والله بكل شئ عليم ○

محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء